ڈاکٹر مفتی اویس پاشا قرنیؔ

قضیۂ فلسطین

مدیرِ فقہ اکیڈمی حضرت ڈاکٹر مفتی اویس پاشا قرنی صاحب مدظلہ کی اصلاحی مجلس

اس وقت آپ جانتے ہیں کہ ارضِ فلسطین پر معرکۂ حق و باطل جاری ہے۔ اور حق و باطل کی اس کشمکش میں ہم مسلمان کس طرف ہیں، یہی وہ آزمائش اور امتحان ہے جس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بندۂ مومن کو مکلف ٹھہرایا ہے۔ مسلمان مختلف زمانوں اور علاقوں میں حق کی بالا دستی کے لیے جہاد و قتال کے عظیم الشان فریضے کو انجام دیتے رہے۔ اور روے ارضی پر ایک مقام ایسا ہے جس کو اس اعتبار سے نبیِ اکرم ﷺ نے خاص قرار دیا کہ وہاں پر مجاہدین، مقاتلین اور مرابطین موجود رہیں گے۔ زمانے کے بدلنے سے، لوگوں کا ساتھ دینے یا نہ دینے سے اور لوگوں کے کہنے یا نہ کہنے سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور وہ اپنے کام میں برابر لگے رہیں گے۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں انھیں الطائفة المنصورة یعنی ”ایسا گروہ جس کو اللہ کی نصرت حاصل ہے“ کہا گیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید حاصل ہے اور جنھیں بے یار و مددگار چھوڑ دینے سے ان کا نقصان نہیں ہوگا، ایسے لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ مسندِ ابی یعلیٰ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بیت المقدس میں اور اس کے اردگرد پائے جاتے ہیں اور یہ حق پر قائم رہیں گے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ یہ جہاد پر قائم رہیں گے، یعنی جہاد چلتا رہے گا یہاں تک کے یہ دجال سے مقابلہ کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت تک اہلِ حق مجاہدین و مرابطین کے وہاں موجود ہونے کی بشارت فرمائی۔ اور اہلِ شام کا ساتھ دینے پر کئی روایات موجود ہیں۔ اور کئی مواقع پر قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ ﷺ کا مشہور فرمان ہے: «عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ» (موارد الظمآن، حدیث: ۲۳۱۲) ”تمھیں چاہیے کہ شام کا ساتھ دو“۔ بعض صحابۂ کرام نے ان

روایات کے پیشِ نظر وہاں ہجرت بھی فرمائی اور وہاں جاکر آباد ہوئے۔ چنانچہ ارضِ شام نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی ایمان کا ایک مرکز رہا۔ اور بہت سے انبیاے کرام علیہم السلام کی اولادیں بھی وہاں آباد رہیں، پھر صحابۂ کرام کی اولادیں آج تک وہاں آباد ہیں۔ اس پورے خطے کو نبیِ اکرم ﷺ کے زمانے میں ارضِ شام کہا جاتا تھا، اسے محشر بھی کہا جاتا ہے۔ ان معنیٰ میں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بیت المقدس میں انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی۔ چونکہ معراج کے واقعے میں آپ ﷺ نے رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں کعبۃ اللہ سے بیت المقدس کا سفر فرمایا اور بیت المقدس میں آپ ﷺ نے انبیاے کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی۔ اسی زمینی سفر جو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف تھا اسے ''اِسراء'' کہتے ہیں۔ وہاں ایک پتھر ہے جس کے اوپر اب سنہرا گنبد بنایا گیا ہے، جسے قبۃ الصخرۃ کہتے ہیں، یہاں سے آپ ﷺ نے زمین سے آسمان کی طرف صعود فرمایا۔ لہٰذا اس علاقے کو نبیِ اکرم ﷺ اور تمام انبیاے کرام علیہم السلام کے جمع ہونے کی وجہ سے بھی فضیلت حاصل ہے اور آپ ﷺ سے پہلے بھی یہ علاقہ انبیا علیہم السلام کا مسکن رہا ہے اس لیے اس اعتبار سے بھی بابرکت رہا ہے۔

موجودہ فلسطین جو آج مقبوضہ فلسطین ہے وہ بھی اسی شام کا ایک حصہ ہے۔ جدید تعبیر میں سیریا کا جو مرکز ہے یعنی دمشق، اس کو شام سے تعبیر کرتے ہیں، مگر احادیثِ مبارکہ میں جسے ارضِ شام کہا گیا ہے وہ کافی وسیع ہے۔ اس میں سیریا، لبنان، اردن، فلسطین اور مصر کا وہ حصہ جو صحراے سینا کی طرف ہے وہ بھی، اسی طرح ترکیہ کے وہ علاقے جو شام کی سرحد کے ساتھ لگتے ہیں، وہ بھی اس ارضِ شام کا حصہ ہیں۔ اس ساری سر زمین کو قرآنِ حکیم ارضِ مقدس کہتا ہے۔ انبیاے کرام علیہم السلام نے بھی اس کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے موقعے پر اس خواہش کا اظہار کیا کہ یا اللہ! مجھے وہاں موت عطا فرمائیں جو جگہ بیت المقدس سے قریب ہو۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب معراج کے واقعے کو بیان فرمایا، تو فرمایا کہ میں تمھیں وہ جگہ دکھا سکتا ہوں، (یعنی وہ جگہ جہاں موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے ہیں)۔ جب آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تو آپ کو یہ مشاہدہ کروایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ انبیاے کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں اور ان کی ایک خاص طرح کی

حیات قبر میں بھی جاری رہتی ہے۔ اور یہاں نوعِ انسانی کا ایک عظیم واقعہ ہے کہ سارے انبیاے کرام علیہم السلام ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے سردار محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی امامت فرمارہے ہیں۔ اگر یہ واقعہ اس سے پہلے کہیں اور پیش آیا تھا تو وہ عالمِ ارواح تھا کہ وہاں سب جمع تھے۔ تو اس اعتبار سے یہ علاقہ بہت ہی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اور یہ تمہید اس لیے باندھی ہے تا کہ یہ جو تصور ہمارے ہاں عام ہو گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلسطین کا مسئلہ یہ تو علاقائی مسئلہ ہے، سیاسی مسئلہ ہے، عربوں کا مسئلہ ہے، اس غلط فہمی کا ازالہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ علاقہ بابرکت ہے اور اس میں ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ اس برکت کو اپنے لیے محفوظ رکھیں۔ اس برکت والی جگہ کو امتِ مسلمہ کی میراث جانتے ہوئے اس کی حفاظت کریں اور یہاں کے لوگوں کو یہ جو فضیلت حاصل ہے کہ وہ حق پر قائم رہیں گے، تو ہمیں اپنے آپ کو ان اہلِ حق سے وابستہ رکھنا چاہیے۔ اگرچہ علاقائی اعتبار سے ہم وہاں سے دور ہیں مگر ان شاء اللہ ہمارے دل اس برکت سے جڑے ہوئے ہیں۔ برکت کے منتقل ہونے کے لیے زمینی اتصال ضروری نہیں ہے، وہ برکت ان شاء اللہ اس مسئلے سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہمیں حاصل ہو گی۔ اگر ہم اہلِ برکت اور اہلِ حق کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور ہمارے دل ان سے مربوط ہیں، تو وہ برکتیں ہمارے دلوں، ہمارے اعمال میں اور ہمارے اردگرد ظاہر ہوں گی۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، ہم تو کمزور اور مجبور ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کو یہ حدیث سامنے رکھنی چاہیے کہ: «مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ». (مسندِ احمد، حدیث: ۱۱۴۶۰) "جو تم میں سے برائی دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔ پھر اگر اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے اس کی شناعت بیان کرے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو کم از کم اسے اپنے دل میں برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے"۔ علما نے اس حدیث کو بیان کر کے یہ بھی بتایا کہ اس میں سے پہلے درجے کی نہی عن المنکر کے لیے بعض شرائط اور بعض اہلیتیں درکار ہیں۔ مثال کے طور پر جو پہلا درجہ ہے برائی کو ہاتھ سے بدل دینے کا، یہ اس کے لیے ہے جس کے پاس قوت ہو۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ برائی کو ہٹا کر اس کی جگہ اچھائی لائی

جا سکتی ہو، اگر اچھائی لانے کی طاقت نہ ہو تو پھر درست نہیں ہے۔ یہ طاقت عام طور پر حکمرانوں کے پاس ہوا کرتی ہے۔ اس لیے آپ اکثر شروحاتِ حدیث میں لکھا ہوا دیکھیں گے کہ جو تغییرِ منکر بالید ہے، یہ حکمرانوں کا کام ہے۔ البتہ حکمرانوں کو اپنی ذمے داری کی ادائی پر ابھارنے کے لیے کچھ طریقے ہو سکتے ہیں، پہلے زمانے میں دربار کے مقربین، مصاحبین بادشاہوں کی رائے پر اثر انداز ہوتے تھے۔ جبکہ آج کل مقتدر طبقات پر اثر انداز ہونے کے طریقے اور انداز بدل گئے ہیں۔ چونکہ آج کل حکومتیں عوامی رائے پر چلتی ہیں، اس لیے احتجاج کے راستے سے رائے عامہ کو ہموار کر کے حکومتی پالیسیوں پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔ بہر حال، تغییر بالید مطلقاً حاکم کی ذمے داری ہے۔ اس کے بعد کا جو درجہ ہے وہ نہی عنِ المنکر باللسان ہے۔ اس کے بارے اکثر شروحاتِ حدیث میں لکھا ہے کہ یہ علما کے کرنے کا کام ہے، کیونکہ جسے معلوم ہوگا منکر کیا ہے، وہی اسے روک سکتا ہے۔ جسے یہ فرق معلوم ہی نہ ہو کہ منکر اور معروف یا صحیح اور غلط کیا ہے تو وہ کسی معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا دے گا اور اپنے خیال میں کوئی نیک کام کر رہا ہوگا، لیکن وہ غلطی ہوگی۔ یہ اکثر جاہلوں کا طریقہ ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ نہی عنِ المنکر اصلاً علما کے کرنے کا کام ہے۔ بہرحال، اس حدیث کی روشنی میں ہم میں سے جس پر جتنی ذمے داری عائد ہوتی ہے، موجودہ صورتِ حال میں فلسطینی مظلوموں کے ساتھ ہمیں وہ ذمے داری ادا کرنی چاہیے۔

ایسے موقعے پر جب مسلمان دشمن کے مقابلے کے لیے میدان میں ہوں، یہ نصیحت کرنا کہ ایسا کرنا چاہیے تھا ویسا کرنا چاہیے تھا، یہ مثبت رویہ نہیں ہے۔ یہ باتیں میدان میں اترنے سے پہلے یا بعد میں کی جا سکتی ہیں، عین لڑائی کے وقت اس طرح کی باتیں دشمن کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہیں، اس لیے اس طرزِ عمل سے گریز کرنا چاہیے۔ لہذا حماس کی موجودہ کارروائی کے موقعے پر یہ کہنا کہ حماس کا یہ اقدام درست تھا یا غلط اور اس کو کیا کرنا چاہیے تھا، یہ سب ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔ آج بدقسمتی سے مسلمانوں کے معاشرے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں، ہر وہ شخص جو قرآن و حدیث سے واقفیت رکھتا ہے، اسے معلوم ہے کہ آج جو باتیں مسئلۂ فلسطین اور جہاد و قتال کے بارے میں کہی جاتی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔ بعض باتیں وہ ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے میدانِ جنگ اور جہاد میں کہیں اور قرآن حکیم نے انھیں نقل کیا اور یہی اہلِ حق کی باتیں ہیں۔

اور دوسری طرف ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بعینہ وہی جملے ادا کر رہے ہیں جو حضور ﷺ کے زمانے میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی میدانِ قتال میں جہاد اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کیا کرتے تھے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے خاندان، اپنے دائرۂ اثر اور معاشرے میں اس معرکۂ خیر و شر، حق و باطل میں اہلِ ایمان اور اہلِ حق کی باتوں کی ترویج کا ذریعہ بن جائیں۔ اور اس کے بر خلاف جو باتیں بد اخلاقی، بے غیرتی، حبِ دنیا، نفاق اور بزدلی پر مبنی ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھانے اور خود کو اور اپنے معاشرے کو اس طرح کی باتوں سے دور رکھنے والے بن جائیں۔ اگر اتنی سختی ہو جائے کہ بولنے پر بھی پابندی ہو تو کم از کم دل میں ان برائیوں کو برا جاننا اور اہلِ حق کے لیے دل میں محبت رکھنا ضروری ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم اس نقطۂ نظر سے قرآن و حدیث کا مطالعہ کریں اور ایسے حالات میں کم از کم صحیح نقطۂ نظر پر کھڑے ہو جائیں۔ اور یہ درست نقطۂ نظر ہمارے اکابر علما کی تعلیمات سے ملے گا، مثلاً، شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے پچھلے دو جمعوں میں جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں ان سے قضیۂ فلسطین واضح ہو جاتا ہے۔[1] حضرت نے اتنی سہل اور آسان گفتگو فرمائی ہے کہ کوئی بھی شخص جس کے دل میں ایمان کی رمق ہے وہ خوب سمجھ جائے گا۔ پھر اس نقطۂ نظر کے مطابق اپنا اور اردگرد کے لوگوں کا نقطۂ نظر بنانا یہ اس وقت وہ کام ہے جو میں اور آپ کر سکتے ہیں، یہ ہمارے بس میں ہے، اس پر تو کوئی پابندی اور قدغن نہیں ہے۔ اسی طرح دعاؤں کا اہتمام ہم کر سکتے ہیں، یہ ہمارے بس میں ہے۔ یہاں بھی ایک غلط فہمی ہے جس کا ازالہ ہونا چاہیے، وہ یہ کہ بعض کہتے ہیں کہ کب تک ہم دعائیں کرتے رہیں گے۔ ہم نے دعائیں مانگیں کب ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ جیسی دعا مطلوب ہے اگر ویسی ہو جائے تو حالات بدل جائیں۔ یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے بلکہ قرآنِ حکیم یہی بتلا رہا ہے کہ جب دشمن تم پر چڑھ دوڑے تب پہلے جو کام کرنے کا ہوتا ہے وہ دعا ہے۔ در اصل یہ مادیت کے اثرات ہیں کہ ہم دعا کی اہمیت سے بھی بے خبر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ جب دشمن کا خوف ہو تو کیا کریں؟

---

[1] حضرت شیخ الاسلام صاحب دامت برکاتہم کے دونوں خطبے اس شمارے میں شامل کیے گئے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يُنْجِيكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَيَدِرُّ لَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ؟». ”کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جو تمھیں تمھارے دشمن سے نجات دے اور تمھارے رزق میں اضافے کا سبب بنے؟“۔ پھر آگے فرمایا: «تَدْعُونَ اللهَ فِي لَيْلِكُمْ وَنَهَارِكُمْ، فَإِنَّ الدُّعَاءَ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ». (مسندِ ابی یعلیٰ، حدیث: ۱۸۱۲) ”دن رات اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، بے شک دعا مومن کا ہتھیار ہے“۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنے فلسطینی بھائیوں کے لیے رات کو اٹھ کر دعائیں کرتے ہیں۔ ہماری اس وقت کوئی نماز ایسی نہ جائے جس کے بعد ہم دل سے یہ دعا نہ مانگیں کہ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُ بِکَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ. اسی طرح: حَسْبِيَ اللهُ لا إِلٰهَ إِلّا هُوَ، لاَ حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلّا بِاللهِ. یہ ان لوگوں کے لیے دعا ہے جو امت کی طرف سے فریضۂ جہاد ادا کر رہے ہیں اور مسجدِ اقصیٰ کی حفاظت پر اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مالی طور پر ان کی کمر مضبوط کرنا یہ بھی ہماری ذمے داریوں میں سے ہے۔ فلسطین اور بالخصوص مسجدِ اقصیٰ سے ہمارا ایمانی رشتہ تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ قومی رشتہ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ کسی شخص کے پاس اگر بیت المقدس کے قریب ایک کوڑے بھر جگہ یعنی ایک میٹر جگہ بھی ہو، جس سے وہ دیکھ سکے یہ اس کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔ آج آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں ایک میٹر جگہ کی جو قیمت یہودیوں کی طرف سے ملتی ہے وہ بہت ہی زیادہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں دیتے۔ جان دینے کے لیے تو تیار ہیں لیکن جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں موجود رہیں گے اور اس کی حفاظت پر قائم رہیں گے۔

مسندِ احمد کی روایت ہے جب آپ ﷺ نے مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت بیان فرمائی تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کوئی وہاں نہیں جا سکتا ہو تو وہ اس فضیلت کو کیسے حاصل کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہاں چراغ کے لیے تیل ہی بھیج دے جس سے چراغ جلتا رہے۔ تو آج یہ امداد کی ایک صورت ہے، امداد وہاں پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ امداد کا کام الحمدللہ پاکستان پہلے بھی کرتا رہا ہے اور آئندہ جب بھی ضرورت پڑے گی ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ ۱۹۳۸ء میں بھی جب قردادِ پاکستان پیش ہوئی تھی اس

وقت فلسطین کے لیے بھی ایک قراداد منظور ہوئی تھی اور قائدِاعظم نے ایک فنڈ فلسطین کے لیے مقرر کیا تھا۔علامہ اقبال نے اس موقعے پر قائدِاعظم کو ایک خط لکھا تھا کہ صرف ایک قراداد منظور نہ کی جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کچھ کام کیا جائے جس سے مسلمانانِ فلسطین کو فائدہ ہو۔علامہ اقبال جس طرح پاکستان کے مصور اور مبشر ہیں اسی طرح وہ آزاد فلسطین کے بھی مبشر ہیں۔علامہ نے ایک جملہ کہا تھا: یہ میرے عقیدے کا حصہ ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہودیوں کے ناپاک وجود سے سرزمینِ فلسطین پاک ہوکر رہے گی۔ قائدِ اعظم کے بارے میں ان کی بہن فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ جب ان کے انتقال کا وقت قریب تھا تو ان کی زبان پر تین باتیں تھیں جو بار بار آتی رہیں: ایک مہاجرین کا مسئلہ، دوسرا کشمیر کے مسلمانوں کا مسئلہ اور تیسرا فلسطین کے مسلمانوں کا مسئلہ۔ یعنی مسئلۂ فلسطین ایمانی مسئلے کے ساتھ ساتھ ہمارا قومی مسئلہ بھی ہے۔ عرب اسرائیل جنگ کے موقعے پر پاک فضائیہ نے عرب افواج کا خوب ساتھ دیا اور پاکستان کے نظریاتی بنیاد پر قائم ہونے کے تقاضوں کو پورا کیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس جذبے کو ہم اپنے اندر زندہ رکھیں اور اپنی اولاد میں بھی اس کو منتقل کریں کہ مسلمان کہیں بھی ہیں وہ ہمارے بھائی ہیں اور مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں، اگر جسم کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو اسے پورا جسم محسوس کرتا ہے۔ ہمیں اہلِ ایمان کے ساتھ اپنے ایمان اور ایمانی تعلق کو اتنا مستحکم کرنا ہے کہ ان کا مسئلہ دعا میں ہمیں اس طرح یاد آئے جس طرح دعا کرتے وقت ہمیں اپنے مسائل یاد آتے ہیں۔

*****